ابنِ سعید

ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے
ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ماہ و سال کی گردشیں تھم گئی

ہیں۔ ماضی نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی ہے اور یادوں کا کارواں آج سے ٹھیک ۲۳ سال پہلے اگست ۱۹۴۷ء پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے بی اے سال اوّل کے درجے میں ڈاکٹر حفیظ سید اردو پڑھا رہے تھے۔ میں پہلی نشستوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس پر بائیں ہاتھ کو سہارا دیے ہوئے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ ان کے سر پر چاروں طرف حاشیے کی طرح بالوں کے گچھے رہتے تھے۔ درمیانی حصّہ بالکل صاف تھا۔ پیچھے گردن پر بال بے ترتیبی سے پڑے رہتے تھے جوشِ تقریر میں کبھی کبھی چھڑی اُٹھا کر ہوا میں لہراتے تھے اچانک میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے ٹہوکا دے کر کہا "ذرا دیکھیے ہمارے "سر" کے پیچھے ڈاڑھی ہے!" جملہ اتنے زور سے کہا گیا تھا کہ میں تو چونک اٹھا ہی، کلاس میں بھی قہقہے گونجنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باز پُرس کی تو بڑی معصومیت سے اس طالب علم نے کہا "میں نے اپنے لیے یہ بات کہی تھی!" بعد میں معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام اسرار احمد ہے اور میرے محلے ہی میں رہتے ہیں۔ اس روز کے بعد سے نسبتاً بے تکلفی بڑھی بہت خوش گلو تھے اس لیے اکثر احباب کی محفل میں ان سے جذبی، مجاز اور اقبال کی غزلیں ترنم سے سنی جایا کرتی تھیں۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا حادثہ ہوا۔ میں اس زمانے میں الٰہ آباد کے ایک سہ روزہ اخبار "نیا دور" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کا "گاندھی" نمبر نکلنا تھا میں صبح صبح دفتر جا رہا تھا۔ اسرار صاحب نے راستے میں مل کر ایک نظم دی اور بغیر پڑھے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے نہیں شائع کرنا ہے۔ اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈالنے سے پہلے یوں ہی سرسری طور پر نظر ڈالی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ نظم کتابت کے لیے دے دی لیکن شام کو ان سے بڑی سنجیدگی سے کہا "اسرار صاحب وہ نظم اشاعت کے لیے دے دی گئی۔" کہنے لگے "شکریہ" میں نے کہا "سچ کہیے، جس کی نظم ہوگی وہ مجھے اور آپ کو قبر تک نہ چھوڑے گا۔" بولے "کیا مطلب؟" تیوریاں چڑھ گئیں۔ میں نے کہا "مطلب یہ کہ وہ آپ ہی کی ہے؟" بولے "پھر کس کی ہے؟" میں نے کہا "چرائی ہے۔" بولے۔ "ثابت کر دیجیے تو پانچ روپے حاضر کروں گا۔" میں نے ایک شعر سنا کر کہا "یہ تو آپ کا نہیں ہے۔ یہ تو جوش یا فراق کا معلوم ہوتا ہے۔" بولے "تو دکھا دیجیے۔ شاعری ترک کر دوں گا۔" وہ شعر یہ تھا۔

لویں اُداس، چراغوں پہ سوگ طاری ہے
یہ رات آج کی انسانیت پہ بھاری ہے

مگر میں جوش یا فراق یا کسی اور کے دیوان میں یہ شعر کہاں سے دکھاتا۔ اب ان کی حیثیت ہمارے حلقے میں ایک شاعر کی تھی۔ ایسا شاعر جو فراق، سلام مچھلی شہری اور وامق جونپوری کے سامنے بیٹھ کر نظمیں سناتا تھا اور لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے اس زمانے میں یہ بھی انکشاف ہُوا کہ سولہ برس کے تھے تو ۱۹۴۲ء میں ایک نظم لکھی تھی "بلّٰہ نہ رو کو جانے دو" مجھے یہ نظم زبانی یاد تھی مگر سمجھتا تھا کہ شمیم کرہانی کی ہے۔ وہ نظم بھی اشاعت کے لیے دے دی گئی۔ مگر کسی نے بھی دعویٰ نہ کیا اور اسرار صاحب ہی اس نظم کے خالق قرار پائے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ ایسے موضوعات منتخب کرتے تھے جن پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا "مرگھٹ کا پیپل" "بانسری کی آواز" "سنگتراش نے کہا" "خون کا مےخانہ" وغیرہ اس زمانے کے دو تین شعر یاد آ گئے۔

دکھائی دی تھی جہاں پر گناہ کی منزل
وہیں ہوئی تھی دلِ ناصبور کی تکمیل

بس اتنا یاد ہے اسرار وقتِ مےنوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی دل کو سمجھانے

جو کہہ سکے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

شاعر کی حیثیت سے تیغ الٰہ آبادی (مصطفےٰ زیدی) اور راہی معصوم رضا دونوں ان کے معترف تھے۔ اس زمانے میں ماہنامہ "نکہت" کا آغاز ہُوا تھا۔ صبح سے شام تک بڑی دلچسپ صحبتیں رہتی تھیں۔ جس میں حسین حیدر صاحب مرحوم کی حیثیت صدر نشین کی ہُوا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ ہم سب کے بزرگ تھے اور برادرِ محترم عباس حسینی صاحب کے والد، مگر ہم سب لوگوں کے ادبی مشاغل میں بڑے انہماک و دلچسپی سے شامل ہوتے تھے۔ اسرار صاحب نے "تماڑازم" کے عنوان سے ایک طنزیہ سُنایا۔ بہت پسند کیا گیا اور "طغرل فرغان" نام تجویز ہُوا۔ پھر نکہت میں وہ "طغرل فرغان" اور "عقرب بہارستانی" کے نام سے طنزیہ مضامین بھی لکھنے لگے۔ الٰہ آباد سے ایک روزنامہ "نوائے ہند" نکلتا تھا۔ اس میں بھی "طغرل فرغان" کے نام سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ طنز و مزاح لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس کے بہت مدّاح تھے اور شفیق الرحمان کا مذاق اُڑایا کرتے تھے کہتے تھے۔ "لیکاک کی مسلم فینٹسی پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے!"

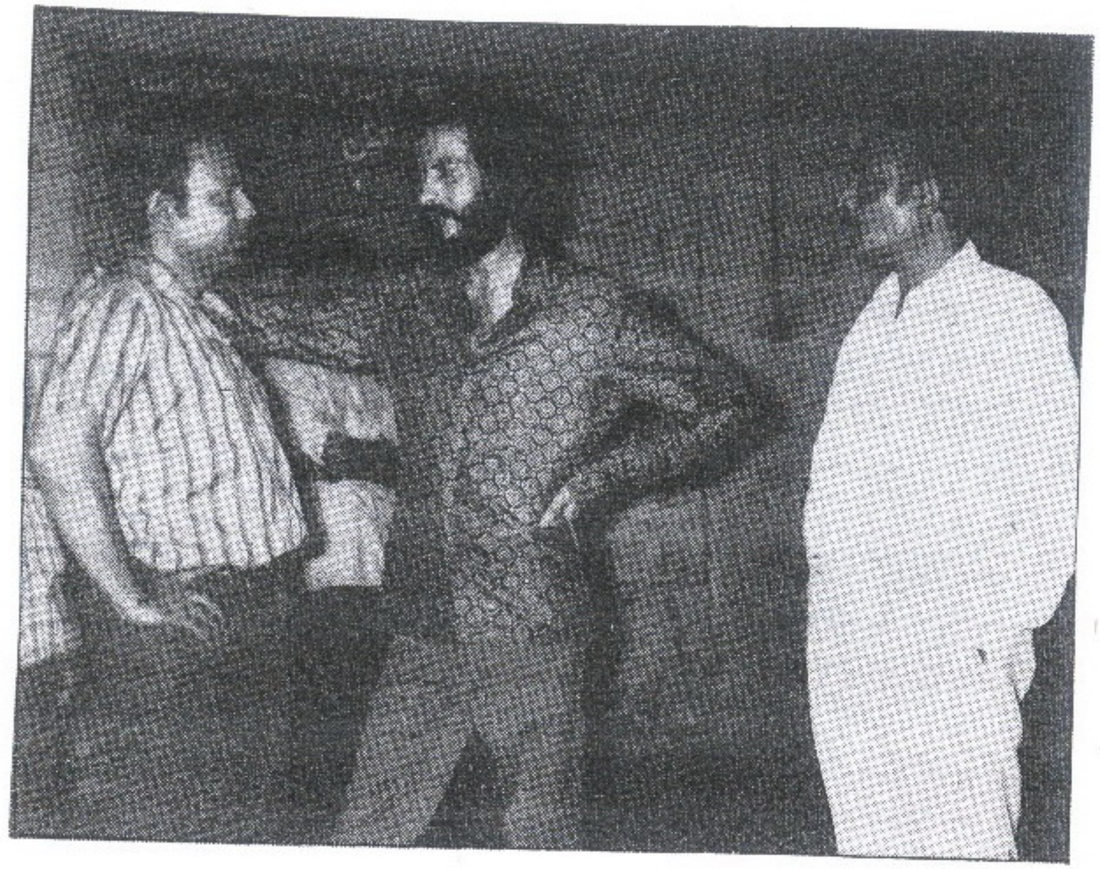

اب شاعری پسِ پُشت چلی گئی۔ اسرار احمد جو نارہ ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے تھے اور اس لحاظ سے خود کو اسرار ناروی لکھا کرتے تھے طغرل فرغان ہو گئے۔ "نکہت" اور "نوائے ہند" کو ملا کر سو کے لگ بھگ طنزیہ مضامین لکھے ۱۹۵۱ء تک یہی کیفیت رہی۔ ایک روز انہوں نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر بہت غصّہ آیا اس لیے کہ وہ بہت فحش تھی۔ سناتے جاتے تھے اور غصّہ بڑھتا جاتا تھا لیکن کہانی کے اختتام نے مُنہ پیٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس لیے کہ کہانی کا مرکزی کردار جسے ہم سب عورت سمجھ رہے تھے وہ ایک بالتو بلّی ثابت ہوئی۔ ذہن میں ایک خیال آیا اور سیکسٹن بلیک کی طرز پر اردو میں ایک جاسوسی ماہنامے کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔ اس منصوبہ بندی میں بھیّا (عباس حسینی) جمال صاحب (شکیل جمالی) راہی اور حسین حیدر صاحب بھی شامل تھے ان کا خیال تھا کہ راہی بہت اچھی جاسوسی کہانیاں لکھ سکتے ہیں اس لیے کہ ہم لوگوں کے مقابلے میں وہ گارڈنر، پیٹر شینی، ایڈگر ویلس، اگاتھا کرسٹی وغیرہ کو بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے بلکہ بڑی برق رفتاری کے ساتھ پڑھتے تھے اور لکھتے بھی تھے لیکن راہی کو نظر انداز کر کے میں نے وکٹر گن کا ایک ناول منتخب کیا کہ اسی کو بنیاد بنا کر ایک کہانی لکھی جائے۔ یہ کام اسرار احمد کے سُپرد ہُوا۔ انہوں نے ایک ہفتے میں ناول مکمل کر کے حوالے کر دیا اور اسے پڑھنے کے بعد راہی نے بھی جاسوسی ناول لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں ناول نگار کا نام ابنِ صفی منتخب ہُوا کہ اسرار صاحب کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی مہینے میں جاسوسی دُنیا کے پہلے شمارے کی حیثیت سے یہ ناول شائع ہُوا اس ناول کا نام تھا "دلیر مجرم"۔ جس میں پہلی بار انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید روشناس کرائے گئے تھے۔ ایک ناول اور "جواہرات کی ملکہ" کے نام سے شائع ہُوا تھا، رائیڈر ہیگرڈ کے ناول "کنگ سالومن مائنز" سے مستعار تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو ناول لکھے جو اُن کے طبع زاد ناول تھے۔ ان ناولوں کی مقبولیت کے بارے میں کچھ لکھنا عبث ہے۔ صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کی فروخت اُردو اور ہندی کے کسی ناول نگار کے ناولوں کے مقابلے میں بلا خوف و تردید سب سے زیادہ تھی۔ اور اس کا راز اُن کا منفرد طرزِ تحریر تھا۔ تجسس اور پُراسرار واقعات سے بھرپور کہانیوں میں طنز کی شگفتگی اور مزاح کی چاشنی ایک سحر کارانہ کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ کسی بھی زبان میں لکھے گئے جاسوسی ناول پڑھیے یہ اندازِ تحریر نہیں ملے گا اور پھر ان سب پر مستزاد ایک باوزن باوقار دلکش زبان۔

واقعات میں سطحیت کا کہیں شائبہ نہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے ان کے ناولوں کے ذریعے اُردو سیکھی۔ اُردو پڑھنے کا ذوق حاصل کیا۔ ہندی میں ان کے ناولوں کا ترجمہ شائع ہوتا تھا۔ ابھی تقریباً ستر پچھتر ناول ایسے ہیں جو ہندی میں شائع نہیں ہوئے۔ لیکن وہ ہندی میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے اُردو میں، البتہ ہندی میں ان کے دو کرداروں کے صرف نام بدلے ہوئے تھے یعنی فریدی کی جگہ ونود اور عمران کی جگہ راجیش۔ حمید اور قاسم اپنے اصلی ناموں کے ساتھ ہی ہندی میں بھی ملتے ہیں۔

یوں تو طلسم ہوشربا کی طرح انہوں نے بے شمار کردار تخلیق کیے اور وہ سب اپنے محدود دائرے میں ذہن پر دیرپا اثرات چھوڑتے ہیں لیکن عمران کا ایسا شاہکار کردار ہے جو فسانۂ آزاد کے خوجی اور طلسم ہوشربا کے عمرو عیار کی طرح ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ درست نہیں کہ ادبی حلقوں نے انہیں نظر انداز کیا۔ اُردو میں آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے دور پر بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے "اردو ادب آزادی کے بعد" اور ڈاکٹر علی حیدر نے "اردو ناول سمت و رفتار" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان سے بیشتر نکلنے والے ناول نمبر یا ناولوں کے جائزے اُن کے تذکرے سے خالی نہیں ہیں۔

ان کی ادبی حیثیت اپنے منفرد اسلوب اور اپنی کردار نگاری کی بنا پر مسلّم ہے اگر انگریزی ادب کانن ڈائل اور اگاتھا کرسٹی کو ادبِ عالیہ کی کرسی عطا کر سکتا ہے تو اُردو میں یہ جگہ صرف ابنِ صفی کے لیے مخصوص ہے۔ یوں تو ان کا ہر ناول بہت مشہور ہُوا لیکن ان میں کچھ ایسے ہیں جو ہر جہت سے اس طرز کے بہت اچھے ناولوں کی صف میں عالمی ادب میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں دشمنوں کا شہر، لاشوں کا آبشار، خونناک ہنگامہ، شعلوں کا ناچ، پتھر کی چیخ، سائے کی لاش وغیرہ بہت اہم اچھے موضوعاتی ناول ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے یہاں واقعات کی رفتار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پورے منظر، پس منظر و پیش منظر کی تصویر کشی پر نہیں لیکن ان کا شاعرانہ مزاج ان کے طنز سے بھرا ہُوا نکیلا قلم کہیں کہیں عصری اہمیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے اور اگر موقع ملا تو ادارہ جاسوسی دُنیا کی طرف سے شائع ہونے والے ابنِ صفی نمبر میں ان پر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسرار صاحب نارہ کے رہنے والے تھے اور کاشتھ نژاد مسلم تھے اور بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ اتفاقی مسلمان ہو ہم لوگ اختیاری مسلمان ہیں ہمارے آباؤ اجداد نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا۔ ان کی والدہ دیو بندی عقائد رکھتی تھیں اور والد بریلوی مسلک کے ماننے والے تھے اور ان کے حلقۂ احباب میں زیادہ تر اثنائے عشری۔ لیکن وہ بذاتِ خود صرف مسلمان تھے اور ان کی یہ خصوصیت ایسی تھی جس کی بنا پر ہر شخص بلا لحاظ عقیدہ ان کی عزت کرنے پر مجبور تھا۔ محلے میں ان کی حیثیت "امین" کی تھی۔ لوگ اپنی امانتیں رکھاتے تھے اور پھر لے جاتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب نے ایک چھوٹا سا صندوقچہ رکھا اس پر گرد جمی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ہی واپس لینے آئے اسی عالم میں ان کا صندوقچہ انہیں واپس ملا۔ میں نے کہا "گرد تو صاف کر دی ہوتی"۔ بولے "غور ہی نہیں کیا اور پھر ایک ذرّہ بھی اگر کم ہو تو وہ امانت میں خیانت ہے" الٰہ آباد میں وہ مجیدیہ اسلامیہ کالج اور یادگارِ حسینی ہائر سیکنڈری اسکول (جو اب کالج ہے) میں مدرس تھے۔ اور بہت کامیاب۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر اجمل اجملی بہت مشہور ہوئے۔ الٰہ آباد میں پانچ سال ان کا ساتھ رہا۔ ان کے والد صاحب پاکستان ہی میں تقسیم سے قبل سے ملازم تھے اسرار اگست ۵۲ء میں اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ہمراہ کراچی چلے گئے۔ الٰہ آباد ہی کے دورانِ قیام ان کی ایک شادی ہوئی لیکن سال بھر بعد ہی ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۵۲ء سے ۶۰ء تک ہم لوگ ایک دوسرے سے دُور رہے۔ صرف خط و کتابت ہی کا سہارا تھا۔ ہر ہفتہ انتہائی پابندی سے خط موصول ہوتا تھا۔ خط اتنے دلچسپ ہُوا کرتے تھے کہ پڑھنے میں ناول کا مزہ آتا تھا۔ میں ۶۰ء میں پاکستان گیا میرے سامنے ہی وہ بیمار ہوئے اور یہ سلسلہ ۶۳ء تک چلا ۶۴ء میں پھر میں پاکستان گیا اور ان سے ملا تھا پچھلے ۱۹ سال سے انہیں نہیں دیکھا۔ مگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ ہے۔ وہ وسیع حلقۂ احباب کے قائل نہ تھے اور بے تکلفی کی حد تک بھیّا جمالی صاحب، راقم الحروف اور راہی کے علاوہ کوئی بھی ان کا "یار" نہ تھا عام لوگوں کی نظر میں وہ بہت خاموش آدمی تھے۔ بلا ضرورت بات نہ کرتے تھے اور دیکھنے والا بڑا معمولی تاثر لے کر اُٹھتا تھا اُن کی شخصیت ملنے والے کو کشمکش میں مبتلا کر دیتی تھی، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، روشن چمکتی ہوئی آنکھیں، اُبھرے ہوئے ہونٹ، بیضوی چہرہ لیکن وہ اپنے کردار عمران کی طرح اپنے چہرے پر حماقت طاری

کر لیا کرتے تھے اور جب ملنے والا چلا جایا کرتا تھا تو یہ سوچ کر مزہ لیا کرتے تھے کہ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو گی لیکن اپنے بے تکلف احباب کے لیے وہ زندگی کا ایک ناگزیر جزو بن کر رہ گئے تھے۔ ۲۴ گھنٹوں میں بلا مبالغہ ۱۲ گھنٹے ساتھ ہی گزرتے تھے میرے پاس نومبر ۷۹ء تک ان کے خطوط آتے رہے اُن کی علالت کی خبر سُن کر بھیّا نے اپنے چھوٹے بھائی جمالی صاحب کو کراچی ان کی عیادت کے لیے بھیجا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق لمبا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اپریل میں جمالی صاحب ان کے پاس ایک مہینہ رہ کر واپس آئے اور اسرار صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار دنوں کی کہانی مئی جون تک میں روزانہ اُن سے سنتا رہا۔ تصویریں دیکھتا رہا۔ اس خبر سے بڑا اطمینان ہُوا کہ وہ اب رُو بہ صحت ہیں۔ میرا پورا خاندان پاکستان میں ہے۔ ان لوگوں نے جولائی تک مجھے یہ اطلاع دی کہ اسرار بھائی پھر ناول لکھ رہے ہیں۔ مگر انہیں اب بھی خون چڑھایا جاتا ہے۔ میں نے بہت سخت خط لکھا اس لیے کہ اتنے عرصے سے خون کا چڑھایا جانا کوئی اچھی علامت نہ تھی اور اس پر سے کام کا جاری رہنا۔ میرے خط کا جواب نہیں آیا۔ پہلی اگست کو ایک شاگرد نے بتایا کہ اخبار میں ابنِ صفی کے انتقال کی خبر چھپی ہے الٰہ آباد اور کراچی سے تصدیق کرائی۔ دل چاہتا تھا کہ خبر غلط ہو مگر دل دھڑکتا بھی تھا۔ چھ تاریخ کو دونوں جگہ سے خبر کی تصدیق ہو گئی۔ ۲۵ جولائی کو انتقال ہُوا ۲۶ کو دفن کیے گئے مرنے سے دو روز پہلے مجھے خط لکھا تھا۔ کیا لکھا ہو گا۔ خدا جانے مجھے آج تک وہ خط نہیں ملا۔

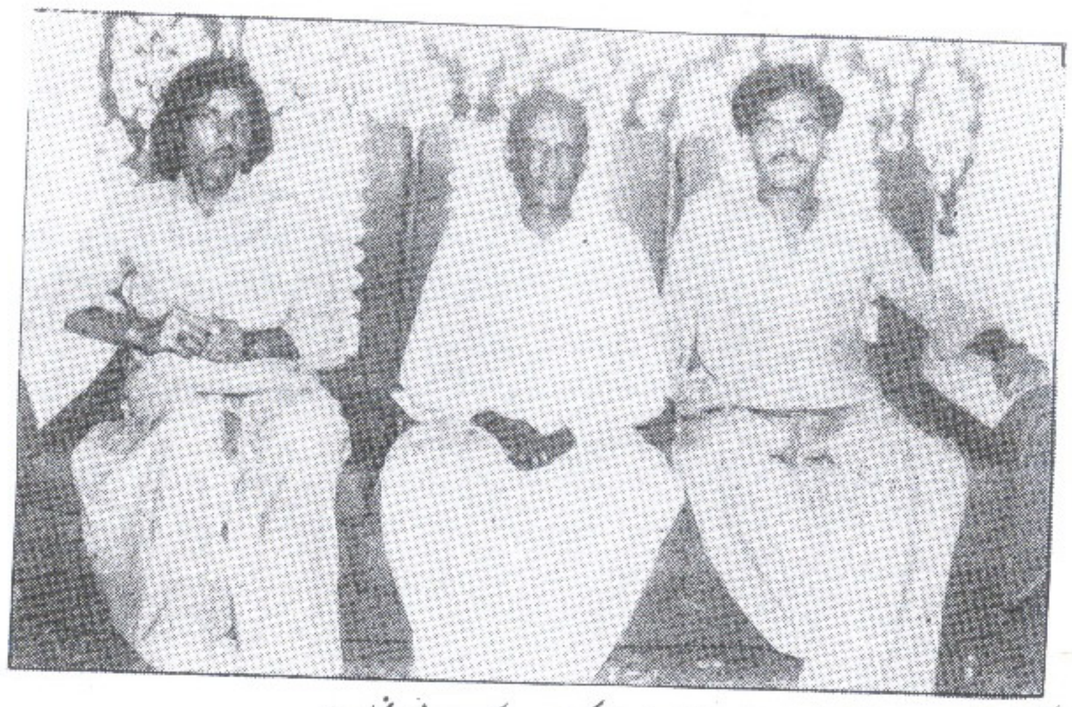

۶۰ء میں جب وہ پہلی بار بیمار پڑے تھے تو ڈاکٹروں کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہُوا تھا حکیم اقبال حسین کے علاج سے صحت یاب ہوئے۔ عارضہ جگر کی خرابی کا تھا پھر ۱۶ سال بعد بیمار ہوئے وہی دیرینہ بیماری اور کچھ برس پہلے ماں کی موت کا صدمہ اپنی طرف سے بے پروائی، سارے زمانے کی فکر حکیم اقبال حسین بھی نہیں تھے جو مرض کو سمجھ سکتے اب معلوم ہُوا کہ بلڈ کینسر تھا۔ کراچی پہنچ کر ایک شادی کی جن سے ۴ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ پھر عقدِ ثانی بھی کیا لیکن اُن سے کوئی اولاد نہیں ہُوئی۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے ایک لڑکا اٹلی میں زیرِ تعلیم تھا۔ یقیناً اس وقت جب انہوں نے آخری بار اس دُنیا پر نگاہ ڈالی ہو گی تو یہ سب رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی نگاہوں نے "بھیّا" "وہ نتھے" "وہ مجن" کو ضرور تلاش کیا ہو گا اور آج ان تینوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے نمناک ہو چکی ہیں۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جب وہ قہقہہ لگاتا ہُوا، سرگوشیاں کرتا ہُوا، نظمیں سُناتا ہُوا، کہانیاں لکھتا ہُوا، نظروں کے سامنے بیٹھا ہُوا دکھائی نہ دیتا ہو۔ ہیں، اگست سے تادمِ تحریر بیمار رہا لیکن بیمار نہ بھی ہوتا تو شاید اس پر کچھ لکھ نہ پاتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس دُنیا سے نہیں گیا ہم سب کے قلم بھی ساتھ لیتا گیا۔ ہونٹوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ بھی لیتا گیا اور پلکوں پر لرزنے والا ستارہ دے گیا۔